تدبرِ قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

۱۔ اس آیت کی تاریخی حیثیت

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مضمون بہت قدیم زمانہ سے اہل مذاہب میں نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ فصیح و بلیغ الفاظ تو ممکن ہے پہلی مرتبہ قرآن مجید ہی میں نازل ہوئے ہوں، لیکن جہاں تک اس کے مضمون کا تعلق ہے یہ کسی کام کے آغاز و افتتاح کے لئے اس قدر موزونیت و مناسبت رکھتا ہے کہ دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کی تعلیم انسان کو بالکل شروع ہی میں دی ہوگی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق خود قرآن مجید میں یہ نقل ہے کہ انہوں نے اپنے باایمان متعلقین اور اپنے ساتھیوں کو جب کشتی میں سوار کرایا تو اس وقت اسی سے ملتے جلتے الفاظ کہے؛

قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ھود - ۴۱)	اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا، بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو جو نامہ لکھا، اس کا آغاز بھی انہی مبارک کلمات سے کیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ	یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بسم اللہ

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ (نمل - ۳۰) الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہے۔

۲۔ یہ آیت دعا ہے

یہ کلام خبر یہ نہیں ہے بلکہ سورۂ فاتحہ کی طرح، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، یہ دعا ہے۔ ایک سلیم الفطرت آدمی کے دل کی یہ ایک فطری صدا ہے جو ہر قابلِ ذکر کام کرتے وقت اس کی زبان سے نکلنی چاہیئے۔ اسی فطری صدا کو وحیِ الٰہی نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے اور ایسا خوبصورت جامہ پہنایا ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورت جامہ کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی کام کرنے سے پہلے جب یہ دعا ارادہ اور شعور کے ساتھ زبان سے نکلتی ہے تو اوّل تو پہلے ہی قدم پر انسان کو متنبّہ کر دیتی ہے کہ جو کام وہ کرنے جا رہا ہے وہ کام بہر حال خدا کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کی پسند کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہونا چاہیئے۔ ثانیاً وہ اس دعا کی برکت سے خدا کی دو عظیم صفتوں ـــ رحمٰن اور رحیم ـــ کا سہارا حاصل کر لیتا ہے۔ یہ دونوں صفتیں اس بات کی ضمانت ہیں کہ اللہ تعالےٰ اس کام میں اُس کو برکت عطا فرمائے، اس کے اختیار کرنے میں اگر اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اس کے وبال سے اس کو محفوظ رکھے، اس کو نباہنے اور تکمیل تک پہنچانے کی اس کو قوت و ہمت دے، شیطان کی چالوں اور فریبوں سے اس کو امان میں رکھے اور دنیا میں بھی اس کام کو اس کے لئے نافع اور بابرکت بنائے اور آخرت میں بھی یہ اس کے لئے رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنے ـــ جو کام اس دعا کے بغیر کیا جاتا ہے وہ ان تمام برکتوں سے خالی ہوتا ہے اسی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کام بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے۔

بسم اللہ کی یہ برکتیں تو ہر کام کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں لیکن خاص قرآن کی تلاوت کا آغاز اس دعا سے کرنے میں کچھ اور پہلو بھی ہیں جو پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔

ایک یہ کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے قرآن مجید کی تلاوت کا آغاز کر کے بندہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے جو اللہ تعالےٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل ابتدائی وحی نازل کرتے وقت ہی دیا تھا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱۔ سورہ علق) (اپنے خداوند کے نام سے پڑھ، جس نے پیدا کیا)

دوسرا یہ کہ یہ مبارک کلمہ اس حقیقت کی یاد دہانی کرتا ہے کہ انسان پر اللہ تعالےٰ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس کو نطق اور گویائی کی نعمت عطا فرمائی جس کی بدولت وہ قرآن کی نعمت کا مستحق بن سکا۔ اس حقیقت کی طرف اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمان اشارہ کر رہی ہے جس کا اس آیت میں حوالہ ہے۔ ایک دوسری جگہ یہ بات تصریح کے ساتھ کہی گئی ہے کہ یہ اللہ تعالےٰ کی رحمانیت ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا، اس کو نطق کی قابلیت عطا فرمائی اور اس کو قرآن کی تعلیم دی۔ فرمایا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۔ خدائے رحمان نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵-۴۔ رحمٰن) کیا اور اس کو گویائی کی تعلیم دی۔

تیسرا یہ کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے متعلق ایک خاص پیشین گوئی کی تصدیق کر رہی ہے جس کی سند پچھلے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ خلق خدا کو جو تعلیم دیں گے وہ اللہ کا نام لے کر دیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچویں کتاب باب ۱۸-(۱۸-۱۹) میں یہ الفاظ وارد ہیں۔

"میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔"

چوتھا یہ کہ جس طرح قرآن مجید خدا کی صفت رحمانیت کا مظہر ہے اسی طرح اس کی صفت رحمانیت ہی ہے جو قرآن کے فتح باب کی کلید ہے، اسی سے اس کے بند دروازے کھلیں گے، اسی سے اس کی مشکلیں آسان ہوں گی، اسی منبع فیض سے قاری پر معانی و حقائق کا فیضان ہوگا اور اسی کے سہارے وہ کجی و گمراہی اور نفس اور شیطان کی آفتوں سے محفوظ رہے گا۔

۳- آیت کے اسمائے حسنیٰ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے تین ناموں کا ذکر آیا ہے۔ اللہ، رحمان۔ رحیم۔ مختصراً ان کے مفہوم بھی سمجھ لینے چاہئیں۔

اللہ:

اللہ کا نام لفظ اِلٰہ پر الف لام تعریف داخل کر کے بنا ہے۔ یہ نام ابتداء سے صرف اس خدائے برتر کے لئے خاص رہا ہے جو آسمان و زمین اور تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ نزول قرآن سے پہلے عرب جاہلیت میں بھی اس کا یہی مفہوم تھا۔ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود اپنے دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی خدا کے برابر قرار نہیں دیتے تھے ان کو اس بات کا اقرار تھا کہ آسمان و زمین اور تمام مخلوقات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اسی نے سورج اور چاند بنائے ہیں، اسی نے ان کو مسخر کیا ہے اور وہی پانی برسانے والا اور روزی دینے والا ہے۔ دوسرے دیوتاؤں کی پرستش وہ محض اس غلط گمان کی بنا پر کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں اور اس کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے یہ خیالات نہایت تفصیل کے ساتھ نقل ہوئے ہیں، ہم اختصار کے خیال سے یہاں صرف دو تین آیتیں نقل کرتے ہیں۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط (۳: زمر) ہم نہیں پوجتے ان کو مگر اس لئے کہ یہ اللہ سے ہم کو قریب کر دیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ج فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۶۱-۶۳ - عنکبوت)

اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنایا آسمانوں اور زمین کو اور مسخر کیا سورج اور چاند کو، کہیں گے، اللہ نے پھر کہاں ان کی عقل الٹ جاتی ہے! اللہ ہی روزی میں وسعت دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور تنگ کر دیتا ہے اس کے لئے۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اور اگر ان سے پوچھو کس نے اتارا بادل سے پانی، پھر زندہ کی اس سے زمین اس کے خشک ہونے کے بعد؟ کہیں گے، اللہ نے۔

اسی طرح تمام قوتوں اور قابلیتوں، تمام زندگی اور موت اور کائنات کے تمام انتظام و انصرام کا حقیقی منبع اور مرکز بھی وہ اللہ تعالےٰ ہی کو مانتے تھے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

(۳۱- یونس)

ان سے پوچھو تم کو کون روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے یا کون اختیار رکھتا ہے تمہارے سمع و بصر پر اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور کون سارے معاملہ کا انتظام کرتا ہے؟ جواب دیں گے، اللہ، پھر پوچھو تو اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟

رحمان اور رحیم:

اسم رحمان، غضبان اور سکران کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور اسم رحیم، علیم اور کریم کے وزن پر صفت کا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رحیم کے مقابل میں رحمان میں زیادہ مبالغہ ہے اس وجہ سے رحمان کے بعد رحیم کا لفظ ان کے خیال میں ایک زائد لفظ ہے جس کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی لیکن یہ تاکید مزید کے طور پر آگیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے استعمالات کے لحاظ سے فعلان کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اور فعیل کا وزن دوام واستمرار اور پائیداری و استواری پر۔ اس وجہ سے ان دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت بھی برائے بیت نہیں ہے بلکہ ان میں سے ایک خدا کی رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کر رہی ہے، دوسری اس کے دوام و تسلسل کو۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی رحمت اس خلق پر ہے بھی اسی نوعیت سے۔ اس میں جوش ہی جوش نہیں ہے، بلکہ پائیداری اور استقلال بھی ہے، اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ اپنی رحمانیت کے جوش میں دنیا پیدا تو کر ڈالی ہو لیکن پیدا کرکے پھر اس کی خبر گیری اور نگہداشت سے غافل ہو گیا ہو بلکہ اس کو پیدا

کرنے کے بعد وہ اپنی پوری شانِ رحیمیت کے ساتھ اس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرمارہا ہے۔ بندہ جب بھی اسے پکارتا ہے وہ اس کی پکار سنتا ہے اور اس کی دعاؤں اور التجاؤں کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ پھر اس کی رحمتیں اسی چند روزہ زندگی ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے ان پر اس کی رحمت ایک ایسی ابدی اور لازوال زندگی میں بھی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری حقیقت اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک یہ دونوں لفظ مل کر اس کو ظاہر نہ کریں۔

۴۔ قرآن میں اس آیت کی جگہ

اس آیت سے متعلق ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید میں اس کی اصل جگہ کہاں ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یوں تو ہر سورۃ کے شروع میں (سورۂ توبہ کے سوا) ایک مستقل آیت کی حیثیت سے لکھی ہوئی ہے لیکن کسی سورہ میں بھی (ماسوائے سورہ نمل) بظاہر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ شامل نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ کسی خاص سورہ کا حصہ بھی ہے یا ہر سورہ کے اوپر یہ صرف بطور ایک متبرک آغاز اور ایک علامتِ امتیاز کے ثبت ہے۔ مدینہ، بصرہ اور شام کے قرا اور فقہا کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورہ کی بھی (بشمول سورۂ فاتحہ) آیت نہیں ہے بلکہ ہر سورہ کے شروع میں اس کو محض تبرک اور ایک علامتِ فصل کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اس سے ایک سورہ دوسری سورہ سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے کسی سورہ کا افتتاح کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

اس کے برعکس مکہ اور کوفہ کے فقہا کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کی بھی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کی بھی ایک آیت ہے۔ یہ مذہب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ اس کو سورۂ فاتحہ کی ایک آیت اور دوسری سورتوں کے لئے بمنزلہ فاتحہ مانتے ہیں۔ مجھے قوی مذہب قرائے مدینہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی رہنمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے۔ اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورۂ فاتحہ اور غیر سورۂ فاتحہ میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر سورہ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے۔ اس کی حیثیت سورہ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔